علامہ شبلیؒ کے تعلیمی افکار اور عصر حاضر میں ان کی معنویت

ظفر الاسلام اصلاحی*

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم (۳ جولائی ۱۹۳۷ء - ۲ فروری ۲۰۰۸ء) کی دارالمصنفین سے شائع شدہ آخری کتاب ''مسلمانوں کی تعلیم'' اپنے موضوع پر نہایت عالمانہ ومحققانہ مطالعہ ہے۔ اس میں اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں مسلمانوں کی شاندار علمی روایات، اسلام اور تعلیم نسواں، مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم اور اس میں اصلاح کے امکانات، موجودہ دور میں دینی مدارس کی اہمیت و معنویت، مسلمان اور عصری تعلیم کے تقاضے، دعوت دین اور مدارس دینیہ کی ذمہ داریاں اور علامہ شبلی کے تعلیمی افکار جیسے اہم موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات کے بعد نہایت اہم پہلو راقم کے سامنے آئے۔ اس کے مباحث کی روشنی میں اور بعض دیگر کتب سے استفادہ کرتے ہوئے موجودہ دور میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دراصل مولانا مرحوم کی ایک وقیع علمی خدمت کے حوالہ سے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔ ظ-ا

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) برصغیر ہندو پاک کی ان نامور شخصیات اور ممتاز دانشوروں میں شامل ہیں جن کی زندگی کا بیش تر حصہ ملی وقومی فلاح وبہبود کے کاموں میں بسر ہوا اور جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین مصرف انہی کاموں کو سمجھا۔ مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی کے مسائل میں تعلیم کے مسئلہ میں علامہ شبلی نے خاص دلچسپی دکھائی۔ انہوں نے تعلیم کو خصوصی اہمیت اس وجہ سے دی کہ میرے بزرگ ومربی اور تقریباً نصف صدی تک علامہ شبلی کی سب سے قیمتی یادگار دارالمصنفین کی بے لوث خدمت انجام دینے والے مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے الفاظ میں ''ان کے نزدیک یہی قوم کی وقعت وعظمت کا پہلا زینہ ہے، اس سے اس کی ذہنی، دماغی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور اسی کی بدولت اس کو ایسے لائق وقابل افراد ملتے ہیں جو اسے قعرِ مذلت سے نکال کر بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں۔''(۱)

مولانا مشرقی تعلیم میں رچے بسے تھے، عصری علوم پر بھی ان کی نظر تھی، مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کو

* ڈائریکٹر، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا

بہت قریب سے دیکھنے، ان کے نظام کو گہرائی سے سمجھنے اور ان کے نصاب وطرز تدریس کا بغور جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔ وہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مسلسل غور وفکر کرتے رہتے۔ وہ جہاں جاتے قدیم وجدید دونوں قسم کے اداروں کے نظام تعلیم وتربیت سے واقفیت حاصل کرنے میں بڑی دلچسپی لیتے، ان کی خوبیوں وخرابیوں کا پتہ لگاتے اور اصلاح کے امکانات کی نشاندہی کرتے۔ اس طرح تعلیم کے مسائل پر ان کی نظر بڑی وسیع وگہری تھی اور اس ضمن میں جو افکار وخیالات انہوں نے پیش کیے وہ ان کے وسیع مطالعہ، طویل تجربے، تعلیمی منظر نامہ کے گہرے مشاہدے کے نتائج تھے، ان کے یہ تعلیمی افکار نہ صرف ان کے زمانہ میں بہت اہم، مفید وبرمحل سمجھے جاتے تھے بلکہ آج کے دور میں بھی ان کی معنویت وافادیت برقرار ہے۔ اس پہلو سے ان کے تعلیمی افکار کا ایک مختصر مطالعہ پیش نظر ہے اور اس مضمون میں خاص طور سے اس پہلو کو اجاگر کیا جائے گا کہ مسلمانوں کی تعلیم کے مقاصد کے باب میں ان کا کیا نقطۂ نظر تھا اور ان مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے کیا لائحہ عمل پیش کیا۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے ان کے کچھ اہم نکات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے جو موجودہ دور میں بھی بڑی اہمیت وافادیت کے حامل ہیں۔

☆ مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ ہر شخص کا انفرادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ براہ راست ان کی ملی زندگی اور اجتماعی مسائل سے وابستہ ہے۔ اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کے اہتمام میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

☆ قدیم وجدید دونوں تعلیم کی ضرورت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن موجودہ صورت حال میں دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

☆ جدید علوم وفنون کی اشاعت اور عصری تعلیم کے پروان چڑھتے ہوئے ماحول میں دینی تعلیم کی اشاعت، توسیع اور استحکام کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے تاکہ دینی علوم کے ماہرین کثیر تعداد میں پیدا ہوسکیں اور وہ ملی واجتماعی مسائل کے حل میں کارگر ومفید ثابت ہوں۔

☆ قدیم وجدید تعلیم میں اس طور پر اصلاح درکار ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں کچھ عصری علوم کے مضامین شامل کیے جائیں اور مسلمانوں کی عصری تعلیم گاہوں میں اسلامیات کی تدریس کا نظم قائم ہو۔

☆ دینی تعلیم کے ساتھ جس جدید مضمون کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ انگریزی زبان ہے اس لیے کہ اس کے بغیر اسلام پر مغربی اسکالرس اور جدید دانشوروں کے اعتراضات سے واقفیت ہوسکتی ہے اور نہ ان کے جواب کی اہلیت پیدا ہوسکتی ہے۔ نیز اسلام سے متعلق انگریزی میں صحیح ومستند لٹریچر کی تیاری کے لیے بھی اس زبان کی مہارت ضروری ہے ورنہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں اسلام واسلامی تعلیمات کے مطالعہ کی طلب رکھنے والے

دوسروں کے تیار کردہ لٹریچر پر انحصار کریں گے اور ان کے سامنے اسلام و اسلامی شریعت کی صحیح ترجمانی نہیں ہو پائے گی۔

☆ تعلیم کا ایسا نظام وضع کیا جائے کہ مختلف فنون کی اختصاصی تعلیم کا اہتمام ہو اور طلبہ اپنی دلچسپی اور رجحان کے مطابق ان میں سے کسی ایک میدان کو منتخب کر سکیں اس لیے کہ متخصصین کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔

☆ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور ان کی قوت استدلال کو تیز کرنے کے لیے درسی تعلیم کے ساتھ انہیں بحث و مباحثہ کا عادی بنایا جائے جیسا کہ قدیم طرز تعلیم میں رائج تھا۔

☆ قدیم تعلیم میں اصلاح کی ضرورت سے انکار نہیں لیکن بلا ترمیم و اصلاح بھی یہ افادیت سے خالی نہیں اس لیے کہ اس تعلیم سے مستفیض ہونے والوں سے بہت سی ملی و اجتماعی ضروریات وابستہ ہیں۔

☆ جدید تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضرورت و افادیت کے باوجود مسلمانوں کو ایسے تعلیمی نظام کی زیادہ ضرورت ہے جس میں اسلامیات کا حصہ غالب ہو اور بقدر ضرورت کچھ عصری مضامین کی تعلیم کا بھی اہتمام ہو۔

☆ قدیم و جدید دونوں تعلیم کا دائرہ کار الگ ہے۔ دونوں تعلیم کے فیض یافتگان میں اجنبیت کم کرنے اور تال میل پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دونوں مل کر مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات پوری کر سکیں اور ان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں ایک دوسرے کو تعاون دے سکیں۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کس حد تک عصری تقاضوں کے آئینہ دار ہیں اس کا ہلکا سا اندازہ ان کے اس تاثر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب یہ بات مختلف فیہ نہیں رہ گئی کہ جدید تعلیم ضروری ہے کہ نہیں۔ اگر کوئی اس ضرورت کا انکار کرتا ہے تو اس کی بات قابل توجہ نہیں۔ اس لیے کہ بدلے ہوئے حالات اور جدید دور کے ابھرتے ہوئے مسائل کے تحت یہ ضرورت امر مسلم بن چکی ہے۔ اس اسے انکار امر بدیہی سے انکار ہوگا۔ (۲)

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے لیے قدیم تعلیم ضروری ہے کہ نہیں۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے تین سوالات اٹھائے ہیں جو بڑے اہم ہیں اور انہی کے غور و فکر میں اصل سوال کا جواب مضمر ہے۔ یعنی قدیم تعلیم بھی ضروری ہے اس لیے کہ اس میں مذہبی تعلیم لازمی عنصر کے طور پر ہے اور اس کے بغیر مسلمانوں کی تعلیم مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سوالات یہ تھے:

۱۔ کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا کچھ اور ہے؟

۲۔ اگر نہیں تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

۳۔ اگر مذہب کی ضرورت ہو تو مذہبی تعلیم قدیم، تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے۔ (۳)

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ اگر انگریزی یا جدید تعلیم کے ساتھ کچھ مذہبی تعلیم شامل کردی جائے تو کیا اس سے مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوجائے گا۔ اس کا جواب انہوں نے اس طور پر دیا کہ مسلمانوں کے یہاں تعلیم کے اہتمام سے مقصود اسلامی علوم کا تحفظ، اسلامی عقائد واحکام کی تشریح وترجمانی اوران پراعتراضات کے ازالہ کی صلاحیت پیدا کرنا ہے اور محض جزوی طور پر دینی تعلیم سے اس اہلیت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ وہ دوٹوک انداز میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا اس قدر تعلیم سے قرآن وحدیث کی حفاظت ہوسکتی ہے، کیااس درجہ تعلیم یافتہ اسلام کے مشکل مسائل کی تشریح کرسکتے ہیں، دوسرے کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ امام، خطیب ومفتی کے فرائض انجام دے سکتے ہیں اور کیا عوام پر ان کا کوئی مذہبی اثر قائم ہوسکتا ہے۔ (۴)

اس سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی قدیم تعلیم کا بہت ہی وسیع تصور رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے ایسے نظام تعلیم کے قیام کے خواہاں وکوشاں تھے جس سے فیض اٹھانے والے اسلامی ومشرقی علوم کے ماہر ہوں، اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ دینی تعلیم یا مدارس کا جو نظام چل رہا تھا وہ اس سے مطمئن تھے اور اس میں کسی اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔ اس باب میں ان کا تاثر یہ تھا کہ ’’قدیم تعلیم میں سخت اصلاح واضافہ کی ضرورت ہے کہ لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں‘‘ ہم ان سے ان سوالات کے جواب چاہتے ہیں:

☆ یورپ کے مصنفین مذہب پر جو حملے کررہے ہیں اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے کہ نہیں۔

☆ اگر علماء خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے۔

☆ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کررہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟

☆ علماء جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے جواب کیوں کر دے سکیں گے۔

☆ کیا علماء سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیے تھے۔ اگر اس وقت اس زمانہ کا فلسفہ سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں۔ (۵)

آخر میں علامہ شبلی نے خود ہی فرمایا کہ ان سوالات کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے۔ دینی مدارس کے فارغین یا علماء کے لیے انگریزی زبان کی بخوبی واقفیت کو وہ اس پہلو سے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ موجودہ صورت

حال میں اسلامیات پر اچھے و مستند لٹریچر کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے اب مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی قرآن و حدیث کو جاننے و سمجھنے کا شوق رکھنے والے اور اسلامی احکام سے واقفیت کی طلب رکھنے والے کم نہیں ہیں، جب انہیں مسلم اسکالرس کی تیار کردہ کتابیں نہیں ملیں گی تو دوسروں سے اپنا شوق بجھائیں گے۔ قرآن کریم سمجھنے کا شوق ہوگا تو سیل (Sale) کا ترجمہ پڑھیں گے، فقہ اسلامی جاننا چاہیں گے تو ہملٹن (Hamilton) کے ترجمہ ''ھدایہ'' پر انحصار کریں گے۔ پھر اس صورتحال پر علامہ نے چبھتا ہوا تبصرہ فرمایا ہے کہ اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزی کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجمہ پر رہ جائے گا۔ تو اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی۔ دوسرے یہ سوال بھی اٹھایا کہ کیا یہ کام علماء کا نہیں ہے کہ وہ انگریزی میں مفید اسلامی لٹریچر تیار کریں۔ (۶) یہاں ندوۃ العلماء کے نصاب میں انگریزی زبان کی تعلیم کی شمولیت پر مولانا سید سلیمان ندوی کے سوال اور علامہ شبلی کے جواب کو نقل کرنا بہت برمحل معلوم ہوتا ہے۔ ''حیات شبلی'' کے مصنف گرامی تحریر فرماتے ہیں:

> غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے۔ مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے یں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی۔ فرمایا عجیب بات کہتے ہو۔ اگر فقہاء انگریزی جانتے اور ہمارے فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے۔ (۸)

یہ بات بڑی اہم ہے کہ دینی تعلیم کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کی سخت ضرورت محسوس کرنے کے باوجود مولانا شبلی برملا یہ فرماتے تھے کہ موجودہ شکل میں (یعنی بااصلاح و ترمیم) میں بھی مدارس کی تعلیم افادیت سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے، دیہات کے مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا خود ایک بہت بڑا کام ہے، سینکڑوں علماء و واعظین کی ضرورت ہے۔ امامت، خطابت و فتویٰ نویسی کے لیے بھی بہت سے باصلاحیت افراد درکار ہیں، یہ سب کام قدیم تعلیم یافتہ حضرات ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے تقسیم کار کے اصول کی رو سے یہ امور انہی کے ہاتھوں میں رہنے چاہیے، ان کی اعانت و تعظیم کی جانی چاہیے اور کسی صورت میں دینی تعلیم والوں کو بے کار نہیں سمجھنا چاہیے۔ (۸)

مدارس میں انگریزی زبان کی معقول نظم کے علاوہ علامہ شبلی نے ان اداروں کی تعلیم کو مزید مفید و کارگر بنانے کے لیے اس پر زور دیا کہ ہندی و سنسکرت، جدید فلسفہ اور علوم طبیعہ کی کتابیں بھی داخل نصاب کی جائیں اور

انہوں نے ندوۃ العلماء میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی۔ ان سب کے علاوہ ان کی یہ رائے بھی بہت اہم تھی کہ نئی صورت حال کے تحت مدارس میں طریق تعلیم و تدریس کو تبدیل کیا جائے۔ جدید دور کے تقاضوں کی روشنی میں طلبہ کو نئے علوم سے بھی روشناس کرایا جائے اور نظام تعلیم کی دوئی کو ختم کر کے قدیم صالح اور جدید نافع کے امتزاج کے طریقہ کو اپنایا جائے۔ (۹)

علامہ شبلی نے تعلیم کے اعلیٰ مرحلہ میں اختصاص (Specialization) کے پہلو پر خاص زور دیا۔ یعنی مختلف فنون میں علیحدہ علیحدہ اختصاصی تعلیم کا اہتمام کیا جائے تا کہ مختلف فنون کے ماہرین پیدا ہوں اور وہ اپنے متعلقہ فن میں نمایاں خدمت انجام دینے کے علاوہ ملت کے بھی کام آسکیں۔ ان کا واضح نقطہ نظر یہ تھا کہ تعلیم سے مقصود نفس فن کی تحصیل اور عام سطح سے اٹھ کر اس میں اختصاص پیدا کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر فن کے مسائل منفرداً اور مستقلاً حاصل کیے جائیں اور اسی پر توجہ مرکوز کی جائے۔ (۱۰)

دراصل یہی اصل طریقہ تعلیم عہد وسطیٰ میں رائج اور بہت مقبول تھا۔ جس کے تحت ہر فن یا مضمون کے استاد سے الگ الگ اس کی اختصاصی تعلیم حاصل کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر فن کے بہت سے متخصصین پائے جاتے تھے۔ (۱۱)

اس کے علاوہ انہوں نے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے بحث و مباحثہ اور مناظرہ کے طریقہ کو پسند فرمایا جو قدیم دور میں ہر بڑے بڑے شہر میں منعقد ہوتا تھا۔ مختلف موضوعات پر جداگانہ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں طلبہ و علماء دونوں شریک ہوتے تھے اور کسی ممتاز عالم کو بحث کے تصفیہ کے لیے حکم کے طور پر منتخب کیا جاتا تھا، علامہ شبلی کی رائے میں یہ مباحثے طلبہ کی ذہنی استعداد کو بڑھانے اور قوت استدلال کو مضبوط کرنے میں بڑے موثر اور بعض اوقات نصابی تعلیم سے زیادہ مفید ثابت ہوتے تھے۔ (۱۲)

اس لیے جدید در میں اس روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں علامہ شبلی نے درس نظامی کے جن پہلوؤں کی تحسین فرمائی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ہر فن یا مضمون کی مشکل یا پیچیدہ کتابیں داخل نصاب ہیں اس کا ایک مفید نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ ان کو سمجھ کر پڑھنے کی وجہ سے طلبہ کی قوت مطالعہ تیز ہوجاتی ہے اور فہم کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ پھر ان کے لیے مشکل سے مشکل کتابوں کو پڑھنا و سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ (۱۳)
گویا کہ علامہ شبلی کی نظر میں مدارس کے نصاب میں ایسی کتابوں کو شامل کرنا مفید ہوگا اور جدید دور میں بھی درس نظامی کے اس پہلو کو اختیار کرنے سے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

علامہ شبلی نے جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا قدیم و جدید دونوں اداروں کے نصاب و طرز تعلیم میں اصلاح کی

ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ دونوں اداروں کے لوگ اپنے اپنے دائرہ میں مطمئن ہیں اور اپنے خیال کے مطابق اپنے کو کامیاب سمجھتے ہیں اس لیے نہ تو اصلاح کی طلب ہے اور نہ اس کے لیے کوشش کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عصری تقاضوں اور ملی ضروریات کے پیش نظر دونوں کی درسیات میں اصلاح اور طرز تدریس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی ضمن میں انہوں نے یہ چبھتا ہوا تاثر بھی ظاہر کیا کہ جدید لوگ اپنے خلاف تنقید سننے پر باآسانی آمادہ ہوجاتے ہیں۔ (۱۴)

ان کی نظر میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی۔ رہا یہ سوال کہ یہ تعلیم کس قدر یا کس نوعیت کی ہونی چاہیے، انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے امامت، وعظ و افتاء جیسی مذہبی خدمات مقصود نہیں ہوتیں اس لیے جدید تعلیم کے ساتھ اس قدر مذہبی تعلیم کا اہتمام مناسب ہوگا کہ طلبہ بقدر ضرورت شریعت کے مسائل اور اسلام کی تاریخ سے واقف ہوجائیں۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ ایک مختصر و جامع سلسلہ دینیات مرتب کیا جائے جو مرحلہ وار اسکول سے کالج تک کی کلاسز کے لائق ہو۔ اس کی مزید وضاحت اس طور پر فرمائی کہ انگریزی یا جدید تعلیم کے طلبہ کو عقاید، فقہ اور تاریخ اسلام کی کتابیں پڑھانے کا نظم کیا جائے اور اہم بات یہ کہ تعلیم کے مراحل کے اعتبار سے دینیات کی درسیات کی نوعیت واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اسکول کلاسوں میں صرف سادہ عقید، فقہ اور تاریخ اسلام کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی منتخب تصنیفات خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحات سے زیادہ نہ ہو۔ (۱۵)

اس تفصیل سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے ذہن میں جدید تعلیمی اداروں میں دینیات کا مختصر و جامع لیکن انتہائی معیار نصاب تھا۔ کالج میں دینیات کے نصاب میں امام غزالیؒ، ابن رشدؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں کے اقتباسات کا شامل کیا جانا اہمیت سے خالی نہیں ہے۔

کالج کے طلبہ یا جدید تعلیم حاصل کرنے والوں کی مذہبی و اخلاقی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا یہ نقطۂ نظر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے لیے محض کتابی تعلیم کافی نہ ہوگی۔ صرف دینیات کی کتابیں پڑھانے سے ان میں مذہبی اثر پیدا ہوسکتا ہے اور نہ مذہبی امور کی پابندی ان میں آسکتی ہے۔ ان کی رائے میں اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ:

☆ جدید تعلیم گاہوں میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے، ان میں دینی باتوں کی اہمیت جاگزیں ہوجائے اور ان میں ان باتوں پر عمل کی رغبت پیدا ہوجائے۔

☆ دینیات کے امتحان کو اہمیت دی جائے اور اس کے نتائج کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے (غالباً اس سے مراد یہ رہی ہوگی کہ آخری امتحان کے نتیجے میں اس مضمون کے نمبرات بھی محسوس ہوں)۔

☆ کالج میں دینیات کی تدریس کے لیے علماء (یعنی دینیات کے ماہرین) معقول مشاہرہ پر مقرر کیے جائیں۔

☆ کالج میں وعظ وتذکیر کا بھی اہتمام ہو اور وعظ کے وقت ارکانِ کالج بھی اپنی موجودگی کو یقینی بنائیں۔

☆ مذہبی امور کی پابندی کرنے والے طلبہ کی تحسین وحوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ ان سب پر مزید یہ کہ (جسے علامہ شبلی نے سب سے مقدم کہا ہے) کالج کے سند یافتہ دو چار طلبہ کو وظیفہ دے کر ان کے لیے دینیات کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔ (۱۶) بظاہر اس سے مقصود انہیں مدارس کی تعلیم سے مستفیض ہونے کا موقع فراہم کرنا تھا۔

تعلیم کے دونوں نظام (قدیم و جدید) میں اصلاح وترمیم کے لیے مفید و مناسب تجاویز پیش کرنے کے علاوہ علامہ شبلی نے اس نکتہ پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں کو دونوں قسم کی تعلیم درکار ہے۔ دونوں تعلیم کے فیض یافتگان ملت کے ضروری اجزاء ہیں۔ انہیں آپس میں دست و بازو ہو کر کام کرنا چاہیے تاکہ دونوں کی صلاحیتیں اجتماعی مفاد کے کاموں میں صرف ہوں اور دونوں اپنے اپنے طور پر مفید خدمات انجام دے سکیں۔ (۱۷)

علامہ شبلی کا یہ نقطہ نظر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ دونوں طبقہ کے لوگوں کے میدانِ کار جدا جدا ہیں لیکن دونوں میں دوری کم کرنے اور تال میل پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ طلبہ کو اس طور پر تربیت دی جائے کہ وہ تعصب وتنگ نظری سے دور رہیں، ان میں اپنی برتری کا احساس غالب نہ ہونے پائے۔ ان کی رائے میں اس صورت حال کو بدلنے کی سخت ضرورت ہے کہ قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم کے پروردہ ایک دوسرے کے حریف ومخالف نظر آتے ہیں یا ایک دوسرے کے لیے ایسے اجنبی معلوم ہوتے ہیں کہ ایک ساتھ رہنا وتبادلہ خیال کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ (۱۸)

ان خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج پر بہت زیادہ زور دینے کے بجائے اس بات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ دونوں طبقہ کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور ربط وتعاون کا ماحول قائم ہو، دونوں اپنے حدود میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے رہیں تو اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا اور اختلاف و انتشار بھی کم ہو جائے گا۔ قدیم و جدید تعلیم حاصل کرنے والوں میں ربط وتعاون اور اجتماعی مفاد کے کاموں میں دونو ں کی صلاحیتیں بروئے کار لانے سے متعلق علامہ شبلی کے یہ خیالات موجودہ دور میں بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں جب

کہ ملی زندگی میں ابھرنے والے نت نئے مسائل کے پیش نظر دونوں تعلیم کے فیض یافتگان کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے اور دونوں میں تال میل پیدا کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ علامہ شبلی کے زمانہ میں مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے کوششیں زوروں سے جاری تھیں، ان میں رفتہ رفتہ اس کا رواج بڑھ رہا تھا۔ اس باب میں سرسید تحریک کلیدی کردار ادا کررہی تھی اور عصری تقاضوں اور ملی ضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے اکتساب پر کافی زور دیا جارہا تھا، اس صورت حال میں اگر کسی گوشہ سے مشرقی تعلیم کی توسیع وترقی یا جدید جامعات میں اس تعلیم کے اہتمام سے متعلق کوئی آواز اٹھتی یا سرکاری و غیر سرکاری سطح پر اس کے لیے کوئی پروگرام تشکیل دیا جاتا تو بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے اور اس سلسلہ میں مضامین بھی لکھتے تھے کہ اس سے جدید تعلیم کی اشاعت متاثر ہوگی جس کی ضرورت اب بڑھ گئی ہے اور جس میں مسلمان اب دلچسپی لینے لگے ہیں۔ علامہ شبلی اس نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ان کا یہ خیال تھا کہ مشرقی تعلیم اور جدید تعلیم کی راہیں الگ الگ ہیں، اول الذکر کی توسیع و اشاعت کے لیے کوششیں دوسری کے لیے ہرگز حارج نہ ہوں گی، دوسرے مسلمانوں نے جدید تعلیم کی اہمیت و افادیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور وہ اس جانب راغب بھی ہورہے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ان کے لیے مشرقی و مذہبی تعلیم کے اہتمام کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ جدید دور میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ انگریزی یا جدید تعلیم کے میدان میں سرگرمیوں کے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر مذہبی تعلیم کا اہتمام بھی جاری ہے۔ یورپ میں جدید تعلیم کافی ترقی پر ہے لیکن ان میں ایک وسیع طبقہ ایسا موجود ہے جو مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت میں مصروف ہے اور اس طرح وہ مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کے تحفظ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ خود اپنے ملک میں آریہ کی مثال موجود ہے۔ وہ انگریزی تعلیم میں کافی ترقی پر ہیں۔ دوسری جانب وہ گروکل بھی قائم کررہے ہیں جس میں ان کے مذہب اور سنسکرت کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر جاری رہتی ہے۔ ان تعلیم گاہوں سے اصل مقصود ان کے مذہب ولٹریچر کی اشاعت وحفاظت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان اداروں نے آریوں میں انگریزی تعلیم کو کم کردیا ہے یا ان کی انگریزی تعلیم پر کوئی برا اثر ڈالا ہے۔ ان کے خیال میں اس سوال کا جواب نفی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل ان باتوں سے علامہ شبلی کا مقصود یہ گوش گزار کرنا تھا کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کی ضرورت و افادیت بالکل واضح ہوچکی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہبی تعلیم یا دینی اداروں کی ضرورت باقی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ضرورت علیٰ حالہ باقی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گی۔ ان کا واضح موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے مشرقی و مذہبی تعلیم کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ مسلم معاشرہ کے لیے اس تعلیم کے ماہرین کی ضرورت ناگزیر ہے۔ خواہ جدید تعلیم کی طلب کتنی ہی بڑھ جائے۔ مشرقی و

مذہبی تعلیم کا تعلق مسلمانوں کی صرف ذاتی وانفرادی زندگی سے نہیں ہے بلکہ ان کی اجتماعی زندگی کے بہت سے مسائل بھی اس سے وابستہ ہیں۔ وہ بہت ہی صاف لفظوں میں فرماتے تھے:

> اگر یورپ کو بایں دنیا طلبی پادریوں کی حاجت ہے اور اگر آریوں کو بایں انگریزی خوانی گروکل کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو بھی عربی تعلیم و مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ تعلیم اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمانوں کی قوم کا باقی رہنا ضروری ہے۔ (۲۰)

اس تعلیم کے ضروری ہونے کی وجہ بھی انہوں نے بیان کی کہ چاہے یہ کیسی ہی گئی گزری حالت میں ہو اس میں ایسی چیزیں شامل ہیں جو مسلمانوں کی قومیت (یعنی ملی زندگی) کی روح ہیں اور ان کے مذہب، مذہبی لٹریچر اور تہذیب وتمدن کے تحفظ واستحکام کی ضامن بھی بنتی ہیں۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں:

> میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قایم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی مرتبہ تک پہنچ جائے لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔ بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے، وہ نہایت ابتر وغیر ضرری ہے۔ لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ، کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔ (۲۱)

آخر میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کا ایک بہت ہی قیمتی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کو مسلمانوں کی ملی واجتماعی ضروریات سے مربوط کیا اور یہ انقلابی فکر پیش کی کہ مسلمانوں کی تعلیم سے مطلوب صرف انفرادی زندگی کی تعمیر نہیں بلکہ ان کی مذہبی وثقافتی وملی ضروریات کی تکمیل اور بہت سے اجتماعی مسائل کا حل ان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ پر منحصر ہے۔ ان کی نظر میں تعلیم کی ایک بہت بڑی غرض وغایت یہ ہے کہ دین کی دعوت اور اسلامی احکام وتعلیمات کی تشریح وترجمانی کے لیے افراد تیار ہوں۔ یعنی مسلمانوں کی تعلیم کا نظام اس طور پر مرتب کیا جائے کہ اس کے فیض سے ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں جو نہایت خوش اسلوبی سے دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکیں اور اسلام واسلامی اقدار کی موثر ترجمانی کرسکیں۔ ان میں ایسی اہلیت نشوونما پائے کہ وہ اسلام پر اعتراضات کا مدلل انداز میں جواب دے سکیں اور عصری تقاضوں کے مطابق صحیح ومستند مذہبی لٹریچر تیار کرسکیں۔ علامہ شبلی نے اپنی تحریروں میں تعلیم کے ان مقاصد کی تکمیل پر جو زور دیا اس کا ایک خاص پس منظر تھا، اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں آریوں کی تحریک زوروں پر تھی، انہوں نے خاص طور سے دیہی علاقوں میں

اپنے مذہبی عقائد ورسوم کی تعلیم وتبلیغ کا جال پھیلا رکھا تھا، نومسلموں میں اسلام کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنا اور اسلام کے خلاف ورغلانا ان کی سرگرمیوں کا نہایت اہم پہلو تھا۔ بقول علامہ شبلی اس تحریک کے رہنما اپنی جاں فشانی، ایثار نفسی، قناعت وخود داری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے، ان کے واعظین ومبلغین بڑے تعلیم یافتہ اور سادہ طرز زندگی اور فقیرانہ روش اختیار کرتے تھے، وہ گاؤں گاؤں میں پھرتے تھے، چنے چبا کر پیٹ بھر لیتے تھے اور رات کو درخت کے نیچے سو رہتے تھے۔(۲۲)

اپنے زمانہ کے مخصوص حالات میں وہ آریوں کے ان اوصاف سے بہت متاثر تھے اور وہ یہ بر ملا بیان فرماتے کہ مسلم معاشرہ میں بھی ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علماء کی ضرورت ہے جو دیہات میں پھیل جائیں اور اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی وتبلیغی مراکز قایم کریں۔ اس مقصد کے تحت علامہ شبلی نے مدارس میں جن امور کے اہتمام پر خاص زور دیا وہ یہ تھے:

☆ عربی دانوں کے لیے انگریزی وسنسکرت زبان کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام۔

☆ مدارس میں مبلغین ودعاۃ کی تربیت کے لیے شعبہ اشاعت وحفاظت اسلام قایم کرنا۔

☆ مختلف اضلاع میں اس شعبہ کی شاخیں قایم کر کے مستقل واعظین مقرر کرنا تاکہ وہ دیہاتوں میں ایک ایک دو دو مہینہ رہ کر اسلامی عقاید واحکام کی تعلیم دیں اور خاص طور سے نومسلموں میں وہ دعوت وتربیت کا کام کریں۔

☆ مستقل واعظین ومبلغین کا نظم نہ ہونے تک اس کا ایک عارضی متبادل نظم قایم کیا جائے اور اس کے لیے ائمہ وموذنین کو تربیت دی جائے۔ ان کے لیے اردو کا برس دو برس کا کورس بنایا جائے اور اردو پڑھنے والے نوجوانوں کو قرآن پاک کے ساتھ اردو میں مسائل وعقاید کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں کی مسجدوں میں پھیلا دیا جائے۔ یہ مسجدوں میں بچوں کو تعلیم بہم پہنچائیں اور لوگوں میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہیں۔(۲۳)

علامہ شبلی صرف گفتار کے نہیں بلکہ کردار کے بھی غازی تھے۔ انہوں نے ندوۃ العلماء میں اپنی تجاویز کو ابتدائی شکل میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور صیغۂ اشاعت وحفاظت اسلام کے نام سے ۱۹۰۸ء میں ایک علیحدہ شعبہ قایم کیا۔ اس کے سیکرٹری مولانا شاہ سلیمان پھلواری مقرر ہوئے، لیکن بعض وجوہ سے اس شعبہ کا کام آگے نہیں بڑھ سکا۔(۲۴) پھر انہوں نے اسی مقصد سے ندوہ سے باہر ایک مجلس اشاعت وحفاظت اسلام قایم کی اور سید سلیمان ندوی کو شریکِ ناظم کے طور پر مقرر کیا۔ انہوں نے اس کی سرگرمیوں کو کافی آگے بڑھایا، جس میں نومسلموں کی مردم شماری، ان کے احوال وکوائف کے باب میں معلومات کی فراہمی، ان کی آبادیوں میں احکام اسلام کی ترویج و

اشاعت کا اہتمام اور مضامین، خطوط، اشتہارات و پمفلٹ کے ذریعے مسلمانوں میں ان کے مسائل کے تئیں بے داری پیدا کرنا اور ان تمام کاموں کے لیے اہل علم و اصحاب خیر سے تعاون کی دردمندانہ اپیل کرنا شامل ہیں۔ یہ تمام کام علامہ شبلی کی نگرانی و ہدایت میں انجام پاتے رہے۔(۲۵)

ان سب سے مقصود یہ تھا کہ ایک ایسا مرکز وجود میں آئے جہاں ایسے داعیان دین تیار ہوں جو مذہبی و مشرقی تعلیم کے ساتھ علاقائی زبانوں اور عصری مضامین سے بخوبی واقف ہوں تاکہ اسلام کی اشاعت اور علمی سطح پر آریہ مبلغین سے مقابلہ کے لیے وہ مفید و کارگر ثابت ہوں، ان کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس مرکز کے زیر اہتمام دیہات وقصبات کی بالخصوص نومسلم آبادی میں احکام اسلام کی ترویج کا اہتمام کیا جائے۔

دین کی دعوت اور اسلام کے دفاع کے لیے باصلاحیت افراد تیار کرنے سے متعلق ان تجاویز و اقدامات سے قطع نظر علامہ شبلی مبلغین اسلام (جنہیں وہ خدام الدین کہتے تھے) کی تربیت کے پورے نظام کو مدارس سے منسلک کرنے کے حق میں تھے۔ درحقیقت وہ خدام الدین کی تربیت کو مدارس کے نظام کا ضروری جز بنانا چاہتے تھے اور اس مقصد سے ان کی درسیات اور طریقہ تدریس میں مناسب ترمیم و اضافہ بھی چاہتے تھے۔ مدارس میں عربی و فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی و سنسکرت کی تعلیم پر زور دینے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ان اداروں کے طلبہ مختلف پہلو سے دین کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ و ترجمانی کے لیے تیار ہوجائیں۔ آریوں سے مقابلہ کے لیے اور ان کی تحریک کے خطرات کے ازالہ کے لیے علامہ شبلی کے ذہن میں مبلغین کی ایک ایسی جماعت کا نقشہ تھا جو محنتی و جفا کش ہو، ایثار وقناعت جیسے اوصاف سے متصف ہو اور سادہ مذہبی زندگی میں رچی بسی ہو۔ اس باب میں وہ اس خیال کے حامل تھے کہ دیہات کے کسی مدرسہ کو خدام الدین کی تربیت کا مرکز بنایا جائے تو زیادہ بہتر و مفید رہے گا۔(۲۶)

یہاں یہ واضح رہے کہ علامہ شبلی نے خدام الدین کی تیاری کیلیے سادگی، ایثار و قناعت اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے بار بار گروکل کے تربیت یافتہ آریہ مبلغین سے سبق حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ اس پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کا تبصرہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے، خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

> ہندوستان کے مخصوص حالات میں مولانا پر اس وقت گروکل کا تصور چھایا ہوا تھا ورنہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کس کی زندگی میں ایثار و سادگی اور قناعت کا نمونہ ملے گا۔(۲۷)

خدام الدین کی تیاری کے لیے ان کی نظر سب سے پہلے مدرسۃ الاصلاح پر پڑی جو اس وقت مجلس اصلاح المسلمین سے مدرسہ کی صورت میں منتقل ہوکر مولانا حمید الدین فراہی کی سرپرستی میں مولانا محمد شفیع کے زیر نظامت ترقی کے منازل طے کر رہا تھا۔ یہ مدرسہ سرائے میر (اعظم گڑھ) کے قریب ایک دیہی علاقہ میں تھا اور اپنی سادگی و

اصول پسندی کے لیے معروف تھا، انہوں نے اپریل ۱۹۱۰ء میں مولانا فراہی کے نام ایک خط میں یہ تجویز رکھی کہ اس مدرسہ کو ''گروکل'' کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت و مذہبی خدمت مطمع زندگی ہو۔ مولانا فراہی کے نام علامہ شبلی کے خط کا یہ حصہ بہت ہی مشہور ہے اور اکثر اس کا حوالہ دیا جاتا ہے:

> کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو اور میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم ونسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔ (۲۸)

یہ قطعی طور پر معلوم نہیں کہ مولانا فراہی نے اس کا کیا جواب دیا لیکن یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ان دنوں علامہ شبلی خدام الدین کی جماعت کے قیام کے تئیں بہت سنجیدہ وسرگرم تھے اور وہ جلد از جلد کسی مدرسہ میں اس کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، چنانچہ ندوۃ العلماء میں انہوں نے اس کی بنیاد ڈال دی، کچھ طلبہ اس کام کے لیے رضا مند ہو گئے۔ ان کو باقاعدہ اس جماعت میں داخل کرنے سے قبل ان کے والدین کی رضامندی بھی حاصل کی۔ ان طلبہ کے لیے روزمرہ زندگی کا یہ اصول وضع کیا گیا کہ وہ کھانے پینے اور رہن سہن میں سادگی اختیار کریں گے، زمین پر سوئیں گے اور احکام اسلامی کی پوری پابندی کے ساتھ تقویٰ وقناعت کی زندگی کو اپنا شعار بنائیں گے۔ (۲۹)

خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ جنوری ۱۹۱۲ء کے شروع میں قایم ہوا اور اسکے تقریباً ایک ماہ بعد ہی مولانا فراہی کے نام خط میں اس جماعت کے قیام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے مختصراً اس کی کارکردگی بیان فرمائی اور یہ امید بھی ظاہر کی کہ تربیت کے بعد یہ طلبہ دیہات میں اشاعت اسلام کے لیے کارگر ثابت ہوں گے۔ (۳۰) ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے علامہ شبلی کی علیحدگی کے بعد ظاہر ہے کہ خدام الدین کی تربیت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن اس کی ضرورت وافادیت ان کے ذہن میں اس قدر رچ بس گئی تھی کہ وہ اس سے غافل نہ رہے۔ ندوہ کی ذمہ داری سے سبک دوشی کے بعد جب انہوں نے اعظم گڑھ کو اپنی مصروفیات کا مرکز بنایا تو پھر ان کے ذہن میں یہ خیال تازہ ہوا کہ مدرسۃ الاصلاح میں خدام الدین کی تربیت کا اہتمام کیا جائے اور اس مدرسہ کے نظام کو اس نہج پر ڈھالا جائے کہ یہ ایسے باصلاحیت داعیانِ دین کی تیاری کا مرکز بن جائے جو بہتر وموثر انداز میں اسلامی اقدار وتعلیمات کی تشریح و ترجمانی کی خدمت انجام دے سکیں اور اسلام مخالف سرگرمیوں کا تدارک کر سکیں۔ ۲۳/اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا فراہی کے نام ان کے تحریر کردہ خط سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ سرائے میر (مدرسۃ الاصلاح) یا اعظم گڑھ (دارالمصنفین) کسی ایک کو ایسا مرکز بنایا جائے کہ اس میں دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ہو۔ خدام الدین کی تربیت کا باقاعدہ نظم ہو اور ایک معقول کتب خانہ بھی قائم ہو۔ (۳۱)

بعد میں اکتوبر۱۹۱۴ء میں مولانا مسعودعلی کے نام ان کے تحریر کردہ خط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ مدرسۃ الاصلاح کو ابتدائی تعلیم کا مرکز اور دارالمصنفین کو درجہ تکمیل بنانا چاہتے تھے، اس طرح ایک پوری جامعہ اسلامیہ یا یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کا نقشہ ان کے ذہن میں تھا، جیسا کہ ان کے ان الفاظ سے مترشح ہوتا ہے:

> دارالمصنفین درجہ تکمیل، سرائے میر کا درجہ ابتدائی، پورا جامعہ اسلامیہ کا مصالحہ ہے، کام کرنے کی ضرورت ہے۔(۳۲)

مسلمانوں کی تعلیم، مدارس، کے نظام تعلیم و تربیت اور تعلیم کو بامقصد بنانے سے متعلق علامہ شبلی کی ان تجاویز کی اہمیت و افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن ان کی آخر الذکر تجویز (خدام الدین کی تیاری کو مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کا ضروری جز بنایا جائے) ابھی منصوبہ بندی یا عمل آوری کے ابتدائی مرحلہ میں تھی کہ وہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوگئے (اللھم اغفر و ارحم وانت خیر الراحمین) اور ان کے اپنے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی تعلیم کا بہت ہی جامع تصور رکھتے تھے، ان کی نظر میں تعلیم نہ صرف یہ کہ ہر شخص کی انفرادی زندگی کی تعمیر و ترقی کا بہترین وسیلہ ہے بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہت سی ضروریات اس سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کے لیے مختلف علوم و فنون کے اکتساب کو ضروری سمجھتے تھے اور ان کے لیے تعلیمی نظام کی تشکیل میں عصری تقاضوں کی رعایت کو کافی اہمیت دیتے تھے۔ ان سب کے علاوہ مذکورہ مباحث سے ان کے تعلیمی افکار کا ایک بہت اہم پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مخصوص حالات اور غیر مسلم مبلغین کی ریشہ دوانیوں کے پیش نظر مسلمانوں کے تعلیمی نظام بالخصوص مدارس کے تعلیمی سلسلہ کو ایک عظیم مقصد سے مربوط کرنا چاہتے تھے اور وہ تھا اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اسلامی احکام و تعلیمات کی بہتر تشریح و ترجمانی اور اسلام مخالف عناصر سے مقابلہ (یا فی الجملہ دین کی خدمت) کے لیے باصلاحیت مخلص، محنتی و جفاکش افراد تیار کرنا، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہ مدارس کو ان افراد کی تعلیم و تربیت کا بہترین مرکز سمجھتے تھے اور اس نقطہ نظر سے ان کے تعلیم و تربیت کے نظام میں اصلاح و ترقی کی جانب اہل مدارس کو بار بار متوجہ کرتے رہے۔ بلا شبہ برصغیر کے موجودہ حالات اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کے سیاق میں علامہ شبلی کے یہ افکار بڑی اہمیت و معنویت رکھتے ہیں اس لیے کہ موجودہ صورت حال میں مسلم معاشرہ کو مختلف علوم و فنون خاص طور سے اسلامی و عصری علوم کے ماہرین کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسلام و اسلامی نظام حیات پر نئے نئے اعتراضات و شبہات سامنے آرہے ہیں، قرآن کریم، پیغمبر آخر الزماں ﷺ اور شریعت اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے

اور اس کام میں ''الکفر ملة واحدة'' کے اصول پر تمام مخالف قوتیں مجتمع اور انتہائی سرگرم ہوگئی ہیں۔ ایسے سنگین حالات میں اسلام کے دفاع اور دین کی خدمت میں منہمک ہوجانے والوں کی ضرورت کس قدر بڑھ گئی ہے، وضاحت کی محتاج نہیں۔ واقعہ یہ کہ علامہ شبلی نے اپنے زمانہ کی صورت حال میں اس بات پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف مشرقی تعلیم کافی ہے اور نہ محض جدید تعلیم سے آراستہ ہونا ان کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کی کفایت کرسکتا ہے۔ بلکہ ان کے لیے ایک ایسا تعلیمی نظام درکار ہے جو مرکب ہو، مشرقی وعصری تعلیم سے۔ (۳۳) مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے علامہ شبلی کے اس نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا فرمایا ہے:

> دراصل وہ دین و دنیا کی خلیج پاٹنا اور قدیم و جدید کا ڈانڈا ملانا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک موجودہ دور میں نہ محض قدیم تعلیم سے مسلمانوں کے مسائل اور ضرورتوں کا حل ممکن ہے اور نہ صرف جدید تعلیم ہی ان کے دکھ اور درد کی دوا ہے۔ دونوں کے مجموعے اور آمیزش ہی میں ان کے مسائل اور پریشانیوں کا علاج ہے۔ (۳۴)

خلاصۂ بحث:

مختصر یہ کہ آج کے حالات میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار ونظریات اور زیادہ برمحل و بامعنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے اجتماعی وملی مسائل کے حل کے لیے دینی وعصری تعلیم میں امتزاج اور دونوں تعلیم کے فیض یافتگان میں تال میل اور ربط وتعاون کی ضرورت اب پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور دوسری جانب اس امتزاج اور ربط وتعاون کا مسئلہ مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ اہم بات یہ کہ علامہ شبلی نے نہ صرف یہ کہ اس مسئلہ کی جانب توجہ دلائی بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق اس کے حل کے لیے تجاویز بھی پیش کیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں کہ انہوں نے مدارس کی تعلیم کو اس طور پر مرتب ومنظم کرنے پر زور دیا کہ ان اداروں سے ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوں جو اسلام کی اشاعت، دین کی دعوت اور اسلامی احکام وتعلیمات کی تشریح وترجمانی کی خدمت بہتر طور پر انجام دے سکیں۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ برصغیر بلکہ پوری دنیا کے حالات کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمانوں میں باصلاحیت، مخلص ومحنتی خدام الدین زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہوں اور بلاشبہ علامہ شبلی کا یہ تاثر بجا ہے کہ دینی مدارس ہی اس طرح کے افراد کی تیاری کے بہترین مراکز ثابت ہوسکتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) ضیاء الدین اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم (دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء)، باب ۹؛ مولانا شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات، ص:۱۳۰
(۲) مقالات شبلی (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۵۵ء)، مقالہ: تعلیم قدیم وجدید، ج:۳، ص:۱۳۹-۱۴۰
(۳) مقالات شبلی، ج:۳، ص:۱۴۰
(۴) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۰
(۵) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۲
(۶) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی (اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۲۰۰۶ء)، ص:۲۰-۲۱
(۷) ایضاً، ص:۱۳۵
(۸) مقالات شبلی، ج:۳، ص:۱۴۲-۱۴۳
(۹) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص:۱۵۳
(۱۰) مقالات شبلی، ج:۳، ص:۱۲۹
(۱۱) ملاحظہ فرمائیں، ظفر الاسلام اصلاحی، تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں (اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۰۷ء)، باب دوم: عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع، ص:۴۴-۷۳
(۱۲) مقالات شبلی، ج:۳، ص:۸۲
(۱۳) ایضاً، ج:۳، ص:۹۹-۱۰۰
(۱۴) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۰
(۱۵) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۱
(۱۶) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۱-۱۴۲
(۱۷) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۳
(۱۸) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۳
(۱۹) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۶-۱۴۷
(۲۰) ایضاً، ج:۳، ص:۱۴۸
(۲۱) شبلی نعمانی، سفرنامہ روم ومصر وشام (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۴۰ء)، ص:۱۸۶-۱۸۷

(۲۲) حیات شبلی، ص:۵۶۱-۵۶۲
(۲۳) ایضاً، ص:۵۶۲-۵۶۴؛ مسلمانوں کی تعلیم، ص:۱۵۵-۱۵۷
(۲۴) ایضاً، ص:۵۵۷-۵۵۸
(۲۵) ایضاً، ص:۵۶۵-۵۷۵
(۲۶) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص:۱۵۷-۱۵۸
(۲۷) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص:۱۶۰
(۲۸) مکاتیب شبلی (اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۷۱ء)، ج:۲، ص:۳۳ (مکتوب نمبر ۵۰)
(۲۹) حیات شبلی، ص:۵۷۶
(۳۰) مکاتیب شبلی، ج:۲، ص:۳۶ (مکتوب نمبر ۵۵)
(۳۱) ایضاً، ج:۲، ص:۴۷ (مکتوب نمبر ۶۸)
(۳۲) ایضاً، ج:۲، ص:۱۳۵ (مکتوب نمبر ۲۵)
(۳۳) مقالات شبلی، ج:۳، ص:۱۶۳
(۳۴) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص:۱۸۰

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سلام سے متعلق

حضرات میں